⊙ ڈاکٹر محمد افضال بٹ

صدر شعبہ اُردو، جی سی ویمن یونیورسٹی، سیالکوٹ

انتظار حسین: ایک اہم علامتی ناول نگار

Abstract:

Intezar Hussain started writing Urdu novels in 1948 after division of sub-continent. He was such an accomplished artist that almost all his writings somehow portray the scenarios of migration, division and human situations caused by these events. He was a unique novelist of new symbols, images, words, metaphors and allegories. History and culture, philosophy, human psychology and recent trends are portrayed dynamically in his writings. The theme of migration is dominant among all his writings because for him migration is not just related to separation from a piece of land rather it is matter of losing monuments of saints, separation from traditions and values, disconnection from history and culture as well as gradual loss of creative identity. Dwelling in the past through novels is a basic principle of his writings. On one hand, this dwelling in the past offered him possibilities to explore signs of human inquisitiveness, efforts and efforts. On the other hand, this helped him to look for his personal identity and self-awareness. Even symbolic system of his novels is linked to past. He depicted memories, dreams, superstitions, religious and historical stories, ups and downs of nations, and mysteries of civilizations in a wonderfully expert manner.

Keywords:

Intezar Hussain Migration Novel Symbolic Symbols Sub-continent

انتظار حسین نے تقسیم ہند کے بعد ۱۹۴۸ء کو اردو میں فکشن کا آغاز کیا۔ وہ اردو کے ایسے تخلیق کار تھے جن کے ناول اور افسانے کسی نہ کسی شکل میں ہجرت، تقسیم اور ان سے پیدا ہونے والی انسانی صورتِ حال کا احاطہ کرتے ہیں۔ وہ نئی علامتوں، استعاروں، تمثالوں اور لفظ کے نئے حوالوں کے منفرد فکشن نگار تھے۔ تاریخ و تہذیب، فلسفہ، انسانی نفسیات اور

عصری رویوں کے حوالے سے ان کی تحریریں پختگی کی عمدہ مثالیں ہیں۔ان کی تمام تخلیقات میں ہجرت غالب نظر آتی ہے، کیوں کہ ہجرت ان کے ہاں محض گلی محلوں اور بستیوں کی خاک سے بچھڑنے کا مسئلہ نہیں اپنے اجداد کی یادگاروں، روایات اور رسموں سے بچھڑنے، تاریخ اور تہذیب کی شہادتوں سے لاتعلق ہونے اور اپنے تخلیقی وجود کی شکست وریخت کا معاملہ تھا۔ان کے ہاں ناولوں کے ذریعے ماضی میں غوطہ زن ہونا بنیادی نقطہ تھا اس سے ایک طرف تو وہ تاریخی تسلسل میں انسان کی مجموعی تگ ودو، تجسس وجستجو کے آثار تلاش کرتے تھے اور دوسرے خود اپنی ذات، اپنی تہذیب اور اپنی شناخت کی جڑیں کریدتے تھے۔ان کے ناولوں کا علامتی نظام بھی ماضی ہی سے وابستہ تھا، یادیں، خواب، توہمات، دیومالا، اساطیر، مذہبی، تاریخی قصے، قوموں کے عروج وزوال اور تہذیبوں کے اتار چڑھاؤ سب کچھ بڑی باریکی سے پیش کرتے تھے۔انتظار حسین اردو ادب کا ایک روشن ستارہ تھے۔ان کا شمار آزادی کے بعد سامنے آنے والے فکشن نگاروں میں ہوتا ہے۔انھوں نے ناول نگاری میں اپنی منفرد اور نمایاں شناخت قائم کی۔ناول میں زندگی کے مختلف رویوں، گوشوں، پہلوؤں اور زاویوں کو اجاگر کیا جاتا ہے لیکن انھوں نے اردو ناول اور افسانے میں فرد کی پہچان کے مسئلے کو اس کے احساس اور اس احساس سے پیدا ہونے والی صورت حال کو پیش کرنے کی کامیاب کوشش کی۔وہ تمام مسائل اور مشکلات کو ماضی کے دریچوں سے جھانکتے ہوئے حال تک رسائی پاتے ہیں۔ان کے ہاں بنیادی تصور ماضی اور ان کی یادوں کا ہے جنھیں وہ اپنے گزرے کل میں دیکھ کر اپنے آج میں آباد کرتے ہیں۔انھوں نے علامت، استعارے اور لوک اساطیر سے اپنے اندازِ فکر کو بھرپور انداز میں بیان کیا:

> ''دراصل انتظار حسین تقسیم وطن کے بعد مہاجروں کی اس نسل سے تعلق رکھتے ہیں جو بعمل مجبوری پاکستان چلے آئے تھے لیکن جن کے روحانی مراکز وہ چھوٹے چھوٹے گاؤں تھے جہاں ان کے مشترکہ خاندان آباد تھے۔پاکستان بننے کے بعد یہ دنیا اجڑ گئی اور انتظار حسین اپنے قافلے کے ساتھ آئے۔انتظار حسین کے تمام افسانے، ناول اور مضامین اسی گم شدہ دنیا کے بارے میں ہیں۔''(۱)

ہجرت کر کے آنے والے شاعروں اور ادیبوں میں ہجرت کے کرب کا پایا جانا فطری عمل تھا۔ان کی تخلیقات میں آبائی سرزمین کو چھوڑنے اور مخصوص تہذیب وثقافت سے علیحدگی کا غم بھی اسی وجہ سے ملتا ہے۔ماضی کا شدید احساس اس انسان کی سوچ کا حصہ ہے جو ہجرت کے کرب سے گزرا ہو۔ہجرت کے واقعہ سے صرف قرۃ العین حیدر ہی نہیں بلکہ کئی اور بھی متاثر ہوئے۔ناصر کاظمی، محمد حسن عسکری، قرۃ العین حیدر اور انتظار حسین سبھی اپنی چھوڑی ہوئی بستیوں کو کبھی فراموش نہ کر سکے۔سب نے اپنے فن پاروں کی شکل میں اپنے ماضی کو زندہ رکھنے کی کوشش کی ہے۔انتظار حسین نے اسی رجحان کے تحت افسانہ نگاری اور ناول نگاری میں شناخت قائم کی۔انتظار حسین کے ناول ماضی کے ماحول کو زندہ رکھنے کی کوشش ہیں۔بستی بھی انھی کھوئے ہوئے دنوں کی داستان ہے جس میں زندگی بڑی سادگی اور بڑی معصومیت سے ایک عجیب کھیل کھیلتی ہے۔انتظار حسین کے ناول تقسیم، ہجرت تہذیبی بحران اور اخلاقی قدروں کے زوال کا نوحہ ہیں۔وہ خود بھی ہجرت کے کرب سے گزرے اس لیے سرحد پار کے گلی کوچے، بازار پرانے رشتہ دار اور ان سے منسوب واقعات ان کے ناول کا

حصہ ہیں۔ان کے ناول وطن کی جدائی ہجرت ماضی گم شدہ معاشرے کے تہذیبی وجذباتی رشتوں کی کہانیوں پر مشتمل ہیں۔
انتظار حسین کے ناوال میں 'تذکرہ' میں اخلاق مرکزی کردار ہے۔ جو تقسیم سے قبل یوپی کے ایک قصبے کا رہائشی تھا۔ تقسیم کے بعد اخلاق اپنی والدہ کے ہمراہ ہجرت کر کے لاہور آتا ہے۔مصنف اس سے قبل 'بستی' میں بھی اپنی ماضی کی داستان کو ناول کے روپ میں امر کر چکے ہے۔'تذکرہ' بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔'بستی' کا کردار ذاکر اور 'تذکرہ' میں اخلاق ایک جیسے ہی کردار ہیں۔

ذاکر کی روپ نگر سے ذاتی وابستگی اور اخلاق کا چراغ حویلی سے لگاؤ دونوں ہی ماضی پرستی کی مثالیں ہے۔
انتظار حسین کو مشترکہ تہذیب، آبائی سر زمین اور آباؤاجداد کی قبریں چھوڑ کر ہجرت کے دکھ نے ہمیشہ بے چین رکھا۔'تذکرہ' میں اخلاق اپنی والدہ کے ساتھ لاہور آبسا ہے۔گھر کے پرانے کاغذات میں اپنے اسلاف کی خاندانی روایات کا تذکرہ ملتا ہے۔ چراغ حویلی کے باسی پرانی شناختوں اور جاگیرداری قدروں کی پاسداری کرتے دکھائی دیتے ہیں۔قیام پاکستان کے بعد ہر فرد تضادات کا شکار ہو چکا ہے۔اور نئے معاشرتی اصولوں کو سمجھنے کی کوشش کر رہا ہے۔لیکن وقت نے تمام سماجی قدروں کو تبدیل کر دیا ہے۔اور دنیا میں ناپائیداری کا احساس جنم لے چکا ہے جس کے شکنجے سے کوئی محفوظ نہیں رہتا:

''ان دو آنکھوں نے اس عمر میں کیا کیا کچھ دیکھ لیا۔ جو جا کے نہ آئے وہ جوانی دیکھی۔ جو آ کے نہ جائے وہ بڑھاپا دیکھتی ہے۔ تیموری بساط کو لپٹتے دیکھا۔ جہان آباد کو اجڑتے دیکھا۔ تایا حضور کو دار پر بلند دیکھا اور اہل جہان آباد تھے زیر آسمان کیا کیا دیکھا۔ جس بادشاہ کو تخت شاہی پر لباس شاہانہ میں رونق افروز دیکھا تھا، اسی کی لاش جمنا کی تپتی ریتی پر پڑی دیکھی۔ تایا حضور نے ایک روز یہ احوال بیان کیا اور اتنا روئے کہ ریش مبارک ان کی آنسوؤں سے تر ہوگئی۔ ایسا اثر ہوا کہ جینے سے جی سرد ہوا رنگ چہرے کا زرد ہوا۔ دنیا کے قصوں بکھیڑوں سے منہ موڑا۔۔۔خانہ نشین ہو گئے مصلے پر بیٹھ گئے۔ طبیعت میں نہ شوخی رہی نہ خوشی کی رمق۔ مزاج میں غم بس گیا تھا الم رچ گیا تھا۔''**(۲)**

اخلاق اپنی والدہ بوجان کے ساتھ لاہور میں گھر کی تلاش کرتا ہے۔ بوجان لاہور میں چراغ حویلی کی گمشدہ شان وشوکت کا رونا روتی عمر کا آخری حصہ گزار رہی ہے۔ بوجان ان مہاجرین کی طرح میں جو رہ تو پاکستان میں رہے ہیں۔لیکن ان کی ذات کا کوئی حصہ کٹ کر ماضی میں رہ چکا ہے۔ بوجان کو جدید طرز کے مکان، گیس کا چولہا، اور پریشر ککر سخت ناپسند ہے۔ چراغ حویلی میں یہ سب سامان نہ تھا۔

وہاں کے چولہے، کچا فرش، کوئل کی صدا اور بیل گاڑی کا سفر انہیں اپنی ذات کے ادھورے پن کا احساس دلاتا ہے۔اس کی وجہ ان کی اپنی جوانی چراغ حویلی میں گزرنا تھا۔ وہ چراغ حویلی سے ہجرت کر کے لاہور تو آ گئے۔لیکن ان کی یادیں اور جذباتی لگاؤ چراغ حویلی سے ہی متعلق تھا۔ وہ ماضی پرست ہے۔ جدید چیزوں سے نفرت اور پرانی قدروں کو نئی قدروں پر فوقیت دیتی ہے۔ بوجان کے پاکستان آنے کے بعد ان کی حالت اس بادشاہ کی سی ہے جس کی سلطنت چھن چکی ہے۔ چراغ حویلی جیسی وضع داری تحکم اور دبدبہ یہاں ممکن نہیں۔اسی وجہ سے کوئل کی آواز سن کر وہ آبدیدہ ہو جاتی ہے۔ان

کے خیال میں ماضی کے گزرے ہوئے حصے کو تخیل کی مدد سے واپس حال میں لانے تک کوئی تصویر مکمل نہیں ہوسکتی۔ وہ چراغ حویلی کا صحن، ڈیوڑھی اور سامان تبدیل شدہ حقیقت سے ہم آہنگ نہ ہونا تھا۔ وہ پرانی یادوں اور قدیم علامتوں سے اپنی شخصیت کی تکمیل کرتی ہے۔

تقسیم ہند نے مشتاق علی اور بوجان جیسے کرداروں کو ان کی جڑوں سے اکھاڑ دیا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ صدیوں سے چلی آ رہی مشترکہ ہندو مسلم تہذیب وثقافت اور رواداری کو بھی زبردست دھچکا لگا۔ مشتاق علی کو جب معلوم ہوتا ہے کہ اس کے بچپن کے دوست پنڈت گنگا دت مہجور کے بیٹے نے شدھی سنگٹھن جیسی فرقہ پرست اور مسلم دشمن جماعت میں شمولیت اختیار کر لی ہے تو اسے احساس ہوتا ہے کہ اب برسوں کی پرانی دوستی اور وضع داری کے خاتمے کا وقت آ چکا ہے۔

''میں نے کہا کہ پنڈت کوئی مجھے بتا رہا تھا کہ تمہارا کشن لال جن سنگھیوں کا لیڈر بن گیا ہے'
پنڈت نے جواب میں سر نیوڑھا لیا۔ شرمندگی سے بولا مشتاق علی تم نے صحیح سنا۔ جب ہی تو اس عاصی پر معاصی نے یہ عرض کیا تھا۔ کہ ہمارا سمے بیت گیا اب کشن لال کا زمانہ ہے۔ باپ ڈھے رہا ہے، بیٹا زور پکڑ رہا ہے۔ پھر بڑبڑانے لگا۔
ڈوبا ہنس کبیر کا جب اوبجیو پوت کمال وائے ہوائے زمانہ تجھ پر کہ تو نے رفاقت کے باغ میں نفاق کا بیج بو دیا اور ہمسائے کو ہمسائے کا دشمن بنا دیا۔ مہجور کا نور نظر کشن لال کل تک مجھے تاؤ کہتا تھا اب مجھے دو پورے سلام کرنے کا روادار نہیں ہے۔''(۳)

وہ عہد فرقہ پرستی اور طبقاتی کشمکش کا عہد نہ تھا۔ ان کا مختلف مذاہب سے تعلق ہونے کے باوجود انسانیت کا مادہ موجود تھا۔ اس وقت تک ہندو مسلم اختلاف، دوقومی نظریے اور شدھی سنگٹھن جیسی فرقہ وارانہ تحریکات نے زور نہیں پکڑا تھا۔ ایک دوسرے کے دکھ درد کا مداوا کیا جاتا تھا۔ پھر اچانک حالت بدل گئے۔ پرانی دوستیوں، وضعداریوں اور رواداری کی جگہ نفرت اور تعصب نے لے لی۔

انتظار حسین نے 'تذکرہ' کے ذریعے تقسیم سے قبل کی زہر آلود فضا اور ماحول کی عکاسی کی ہے۔ اس زمانے میں مسلمانوں میں ترک وطن کا مسئلہ شدت پکڑ چکا تھا۔ ہر گھرانے کے نوجوان جائیدادیں بیچ کر پاکستان جانے جبکہ بزرگ آبائی علاقوں کو چھوڑنے پر راضی نہ تھے۔ چراغ حویلی کے لوگ بھی اسی کرب کا شکار تھے۔ وہ صدیوں سے آباد اس خطے سے جانا نہیں چاہتے تھے۔ مشتاق علی کا بیٹا مصدق علی جائیداد نیلام کر کے پاکستان جانے کا خواہش مند ہے۔ مشتاق علی کسی قیمت پر رضامند نہیں ہوتا۔ مشتاق علی کے لئے نئی سماجی حقیقت کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ وہ اپنے بیٹے کے فیصلے پر نالاں ہے۔

''مصداق علی کے دماغ میں عجب سمائی ہے کہ۔۔۔ پاکستان کی سمت کوچ کیا جائے۔ میں نے تحمل سے بیٹے کا خطبہ سنا۔ جب پیمانہ صبر لبریز ہو گیا تو کہا کہ فرزند جائیداد لٹ جائے کوئی مضائقہ نہیں مگر جائیداد نیلام کی جائے۔۔۔
غیرت کے خلاف جاتا ہے، تو ہمارے جیتے جی تو یہ نہیں ہوگا۔ باقی پاکستان جانے نہ جانے کے بارے میں تمہارا باپ کچھ نہیں کہتا۔ تم بے شک اہل خاندان کو لے کر نئے وطن سدھارو مگر اس افتاد

خاک کو اپنی مٹی میں پڑا رہنے دو۔ قدم ہمارے اس زمین نے پکڑے ہوئے ہیں۔ جہاں کی مٹی
ہے وہیں منار ہو تو اچھا ہے۔ جس دیار میں آنکھ کھولی ہے اسی دیار میں آنکھ بند کریں گے۔'' (۴)

انتظار حسین ہجرت کو اجتماعی سانحہ قرار دیتے ہیں۔ وہ تقسیم کی وجہ سے محروم ہونے والے رشتوں اور قدروں کو عمر بھر بھول نہیں سکے۔ مصنف نے تقسیم اور ہجرت کو تہذیبی تبدیلی کے روپ میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔

بوجان کا کردار ماضی پرستانہ ہے جو نئی سماجی حقیقتوں کو سمجھنے سے قاصر ہے۔ وہ چراغ حویلی کے تسلسل میں مسلسل مکان تبدیل کرتی رہی ہے۔ اخلاق نے معاشی، پریشانیوں کے باوجود ایک مکان خرید لیا ہے۔ وہ اسے ایسا بنانا چاہتا ہے۔ کہ وہ چراغ حویلی کا نعم البدل ہو۔ لیکن ہجرت کا یہ سفر جاری رہتا ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا 'تذکرہ' کے بارے میں لکھتے ہیں:

''' تذکرہ' سیدھی لکیر پر نہیں چلتا۔ اس میں جابجا موڑ اور غلام گردشیں ہیں۔ اس کیکر دار لمحہ کے
لیے ایک ملک میں نظر آتے ہیں۔ پھر دوسرے ملک میں پھر تیسرے ملک میں۔ اسی طرح وہ
صدیوں کو یوں پھلانگتے پھرتے ہیں جیسے ہرڈل ریس دوڑ رہے ہوں۔ بہت کم ناولوں میں ایسے
شعبدہ گری دیکھنے کو ملتی ہے۔'' (۵)

بوجان کی ماضی پرستی ان کی ذات پر غالب آ چکی ہے۔ وہ ہجرت کی حقیقت سے آشنا ہونے کے باوجود چراغ حویلی اپنے دل و دماغ سے نہیں نکال سکیں۔ بوجان شعوری اور لاشعوری طور پر چراغ حویلی کی یادوں سے نجات نہیں حاصل کر سکتیں۔

انتظار حسین اس سے قبل 'بستی' تحریر کر چکے ہے۔ جس میں ملک سے پہلے کے واقعات اور مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے اثرات نمایاں ہیں۔ 'بستی' کے مسائل و مشکلات کے باوجود اختتامی الفاظ روشن مستقبل کی امید ہے۔ ''یہ بشارت کا وقت ہے'' کے الفاظ اچھے دن کی امید تھی۔ اس کے برعکس 'تذکرہ' میں مایوسی اور ناامیدی شدت سے محسوس ہوتی ہے۔ موجودہ سماج بڑے سماجی مسائل سے دوچار ہے۔ ملک سماجی معاشی، اقتصادی طور پر ابتری کا شکار ہے۔ پورے سماج پر بے بسی اور بے حسی کی کیفیت طاری ہے۔ تاریخ ماحول میں دور دور تک کوئی روشنی کی کرن دکھائی نہیں دیتی۔ اسی وجہ سے مصنف کہتا ہے:

''کب تک ان کالے پانیوں میں چلیں گئے۔ کب تک؟ اس لمبی کالی رات کا کوئی انت ہے کہ
نہیں۔ اجالا اور کنارہ کہیں ہے کہ نہیں۔ اور درخت؟'' (۶)

انتظار حسین کے تمام ناول ہجرت تقسیم اور اس کی وجہ سے ہونے والے مسائل پر مبنی ہے۔ 'بستی' اور 'تذکرہ' میں انہی مسائل کا ذکر ہے۔ کفن کو پچاس سال بعد دھوپ دکھانے کی خواہش نیم کے پیٹر، کوئل کی صدا، ماضی سے جذباتی لگاؤ کا اظہار ہے۔ مصنف کی تمام تخلیقات میں یوپی کے مسلم مہاجرین کی ہجرت اور زندگی کی عکاسی نظر آتی ہے۔ وہ کسی بھی قیمت پر نئے سماجی ماحول اور حقیقتوں کو قبول کرنے پر تیار نہیں ہے۔

اخلاق کا کردار 'بستی' کے ارد گرد ذاکر کا دوسرا روپ ہے۔ اخلاق زندگی کی مشکلات مسائل کا سامنا بڑے حوصلے

سے کرتا ہے۔اخلاق کے کردار میں سنجیدگی وسعت نظر اور پختگی کو پروان چڑھنے میں اس کی بیوی زبیدہ کا بڑا کردار ہے۔زبیدہ کے علاوہ بوجان بھی اخلاق کو تحفظ کا احساس دلاتی ہے۔ان سب کے باوجود اخلاق کے لیے ماضی سے پیچھا چھڑانا ممکن نہیں۔اسے بطخوں کی ماند میں پانی کی کمی، شاما نامی چڑیا کو چھونہ سکنے کا غم اور آخر میں کوے کا منڈیر پر بیٹھ کر اڑ جانا اسے اکیلے پن اور ماضی کی یاد دلاتا ہے۔ایسا لگتا ہے مصنف اخلاق کے ذریعے ماضی کے سکون اور سکھ چین کا متلاشی ہے۔'بستی' کے ذاکر کو روپ نگر اور 'تذکرہ' کے اخلاق کو چراغ حویلی ہمیشہ یاد رہتی ہے۔ دونوں صدیوں پرانی تہذیب ثقافت کے خاتمے پر ماتم کناں دکھائی دیتے ہے۔ناول 'تذکرہ' میں ماضی، حال اور مستقبل تینوں زمانے پیش کیے گئے ہیں۔ڈاکٹر وزیر آغا اس سلسلے میں لکھتے ہیں:

''تذکرہ اس اعتبار سے 'بستی' کی توسیع ہے کہ اس میں ماضی اور حال کو ہر ایک دوسرے کے روبرو لا کھڑا کیا ہے۔''(۷)

ناول کی نمایاں بات اخلاق اور زبیدہ کا ماضی کی یاد میں گم ہونے کے باوجود اپنے آپ کو نئی سرزمین پر نئی سماجی حقیقتوں سے ہم آہنگ کر لینا ہے۔جبکہ بوجان ایسا نہیں کر سکیں اور ماضی کی یادوں کا عذاب سینے پر لیے انتقال کر جاتی ہے۔ چراغ حویلی میں بوجان پانچ پشتوں کا آخری سفر اپنی آنکھوں سے دیکھتی ہیں اور آج پاکستان میں چھٹی پیڑھی کے خاتمے کا عندیہ دے دیتی ہے۔اس نے نئی نسل یعنی اخلاق اور زبیدہ کو ماضی پرستی سے نکال کر آگے بڑھنا ہے۔انھیں دوسرے سماجی سیاسی اور معاشرتی مسائل کا سامنا کرنے کے لیے بڑے حوصلے سے کام لینا ہے۔ کیونکہ گنجان آباد شہروں میں اکیلے پن کا احساس، بے حسی، افرتفری اور تاریکی نظر آتی ہے۔اسی وجہ سے انتظار حسین یہ کہنے پر مجبور ہو گئے۔

انتظار حسین کا ناول 'آگے سمندر ہے' ۱۹۹۵ء میں شائع ہوا۔اس سے پہلے مصنف نے اپنے ناولوں 'بستی' اور 'تذکرہ' میں ہجرت کے کرب کو بڑے حقیقت پسندانہ انداز میں بیان کیا ہے۔'آگے سمندر ہے' میں بھی ہجرت کر کے آنے والوں کے مخصوص کرب کو ظاہر کیا گیا ہے۔اس ناول میں معاشرتی اور تہذیبی مسائل کو ایک نئے زاویے سے نئی سمت دی گئی ہے۔اس سمت کا تعلق سماج اور سیاست سے بڑا گہرا ہے۔مہاجروں نے کراچی کو اپنا مسکن بنا کر کہا کہ ان کے آگے سمندر ہے۔اس سارے قصے میں کراچی کو مرکز بنایا گیا ہے۔

'بستی' میں انتظار حسین نے لاہور کا ماحول اور 'آگے سمندر ہے' میں کراچی کے معاملات کو موضوع بنایا ہے وہ اقدار کی شکست وریخت کو احساس زبان بناتے ہیں۔لالچ اور ہوس کے نتیجے میں سماج میں تصادم شروع ہو چکا ہے۔جدید عہد کی مادیت پسند سوچ کی وجہ سے کراچی میں سیاسی معاشرتی اور اقتصادی ہلچل پیدا ہو گئی۔اس تہذیبی اتھل پتھل سے ہولناک بحران پیدا ہو چکا ہے۔معاشرتی فضا خراب ہو چکی ہے۔خودغرضی اور مفاد پرستی نے انسانی رشتوں اور قدروں کو پامال کر دیا ہے۔کراچی میں بسنے والے لوگ ہندوستان کے مختلف علاقوں سے آئے تھے۔اس شہر میں ہر رنگ ہر نسل ہر زبان اور ہر مذہب کے لوگ آباد تھے۔ ہر ایک کا خیال تھا کہ کراچی کی ترقی ان کی وجہ سے ہے۔ناول کا کردار مجو بھائی سنجیدہ مزاج کے ساتھ وارد ہوتا ہے۔ وہ طنز کے تیر دھیمے انداز میں برساتے تھے۔اس کی جواد کے ساتھ ہونے والی گفتگو کو مصنف نے بڑی مہارت سے بیان کیا ہے۔جس میں کراچی میں بسنے والے لوگوں کی زندگی کا احاطہ کیا گیا ہے۔

''میاں یہ شہر ست خصمی شہر ہے۔سندھی، پنجابی، بلوچ، پٹھان، مہاجر۔۔۔یاروں نے یہ شہر بسایا ہے یا کھچڑی پکائی ہے۔رک کے پھر بولے'' اور مہاجر کی کوئی ایک قسم تھوڑی ہے کوئی پورب کا، کوئی پچھّم کا، کوئی اتر سے آیا، کوئی دکن سے چلا سارے ہندوستان سے ندیاں بہتی شور کرتی آئیں اور سمندر میں آ کر مل گئیں۔مگر اس میں کہاں۔یہی تو مصیبت ہے ہر ندی کہتی ہے میں سمندر ہوں۔جواد میاں میں نے ان ندیوں میں اچھی خاصی شناوری کی ہے۔مثلاً کچھ دنوں امروہے کے بیچ بہت گھوما پھرا ایسا لگتا تھا کہ کراچی بس امروہے والوں سے بٹا بڑا ہے جیسے کراچی نہ ہوا امروہے ہی ہو۔''(۸)

کراچی مختلف فرقوں زبانوں اور ذاتوں کو پروان چڑھانے والا مادہ پرست شہر ہے۔اسی میں ہر شخص اپنی نظریاتی اور گروہی وابستگی سے سمندر کی حیثیت اختیار کر لیتا ہے۔ہجرت کر کے آنے والے تقریباً ہر شخص میں کئی قسم کے احمقانہ نظریات اور تعصّبات پائے جاتے ہیں۔کراچی کی اجتماعی فکر اور سوچ کے لیے مصنف نے مجو بھائی کا سہارا لیا ہے۔انتظار حسین سے اپنے استاد محمد حسین عسکری کی طرح ایسے تنقیدی مضامین بھی لکھے ہے جن میں انسان دوستی کے حوالے سے ہندوؤں اور مسلمانوں کو ایک ہی ترازو سے تولنے کی مخالفت کی گئی ہے۔وہ دو قوموں میں مشترکہ ثقافتی ہم آہنگی تلاش کر نے والے جدت پسندوں اور تخلیق کاروں پر تنقید کرتے ہیں۔وہ انھیں مسلمانوں کی ثقافت اور تہذیب کے بارے میں بتاتے ہے۔'آگے سمندر ہے' میں انھوں نے اسلامی تاریخ اور فکر کا منبع پیش کیا ہے۔وہ اپنی روایت کے مطابق کہانی کا آغاز اندلس کے اسلامی پسِ منظر سے کرتے ہیں۔وہ اندلس جہاں مسلمان بڑی شان وشوکت سے رہتے رہتے ان کو وہاں سے نکلنا پڑا:

''یہ اصل میں اس زمانے کا ذکر ہے۔جب عبدالرحمان کے بوئے ہوئے کھجور کے درخت پر سوا دو برس گزر چکے تھے اور آس پاس کتنے درخت اگ چکے تھے۔صحرا کے عرب کی حور اندلس میں رچ بس چکی تھی۔قرطبہ، اشبیلیہ، غرناطہ، طلیلہ کے گھروں کے صحن اب اس کے اپنے گھر تھے اور اشبیلیہ میں بیٹھے ہوئے بزرگ شیخ ابوالحاج یوسف البشر بولی کے کچے گھر کے صحن کے کنویں کے برابر کھڑی کھجور اتنی پھیل چکی تھی کہ وضو کے لیے کنویں سے۔''(۹)

انتظار حسین مسلمانوں کی تاریخ بیان کرتے ہوئے مستقبل کے بارے میں پر امید ہیں۔انھیں مسلمانوں کے تابناک ماضی سے جذباتی لگاؤ ہے۔وہ مسلمانوں کی بقاء اور فلاح کے لیے اسلام پر کار بند رہنے کا درس دیتے ہیں آج تمام سماجی اور فلاحی برائیاں قوانین قدرت سے بغاوت کا نتیجہ ہے۔جواد کے دادا بندہ علی نے ایک بار کہا تھا:

''اندلس کی تاریخ بھی اپنی جگہ فسانہ عبرت ہے۔مسلمانوں نے کیا عروج پایا اور کس طرح قصر مذلت میں گرے کہ صفحۂ ہستی سے ہی نابود ہو گئے اور وجہ بس ایک دین سے پھر گئے۔''(۱۰)

انتظار حسین ختم شدہ یا مسخ شدہ روایات کی تلاش میں ہیں۔وہ انسان کو دھرتی کے ساتھ جڑت کا احساس دلاتے ہیں۔جس طرح درخت کو اپنے اصل مقام سے دوسری جگہ منتقل کرنے کے بعد پانی اور زمین کی ساخت سے مطابقت میں

وقت لگتا ہے۔اس طرح ہجرت کے بعد انسانوں کو بھی نئی جگہ پر مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔جس طرح درخت سے پھل اور گھنا سایہ حاصل کرنے کے لیے اس کی دیکھ بھال کی جاتی ہے اس طرح انسان کی سوچ اور فکر کو نئے ماحول میں ڈھالنے کے لیے سازگار ماحول کی ضرورت ہوتی ہے۔ایسا ماحول جہاں اخوت بھائی چارہ اور رواداری ہو۔ان خوبیوں کی وجہ سے سماج خود بخود بہتری کی راہ پر گامزن ہو جائے گا لیکن اس شہر میں بے اطمینانی اور افراتفری ہے۔انسان کے دل و دماغ پر تعصّبات،نفرتوں،فرقہ واریت اور ذات برادری کا قبضہ ہے۔یہ شہر کبھی امن وسکون کا گہوارہ تھا۔لیکن اب صورتحال مختلف دکھائی دیتی ہے:

> ''اے عبداللہ میں یہ سوچ کر پریشان ہوں کہ یہ تیرا شہر تو بڑا مہربان شہر تھا۔ پالنے والے کی قسم! میں نے اسے سمندر سے زیادہ وسیع القلب پایا تھا مگر اب اس نے مجھے ڈرانا کیوں شروع کر دیا ہے۔'' عبداللہ ابن حبیب کا منہ تکنے لگا پھر تشویش بھرے لہجے میں بولا۔''اے میرے یار تو نے آخر کیا دیکھا کہ خوف کا کلمہ زبان پر لایا''۔میرے دوست یہ ہی بات تو مجھے زیادہ پریشان کر رہی ہے کہ میں نے واضح طور پر کچھ نہیں دیکھا پھر بھی ایک ڈر میرے اندر باہر منڈلا رہا ہے۔کبھی کبھی تو میں زیادہ ہی ڈر جاتا ہوں پتا نہیں کہ میرا محض وسوسہ ہے۔''(۱۱)

انتظار حسین اس شہر کو سکون،محبت،مسرت اور خوشی کا گہوارہ بتاتا ہے لیکن ہجرت کے بعد آنے والے لوگوں نے اس کو بالکل تبدیل کر کے رکھ دیا۔جواد کہتا ہے کہ اس کا قرطبہ والوں سے کوئی تعلق نہیں بلکہ مجو بھائی وغیرہ سے ہے وہ اس شہر بے فیض میں آ کر بس گیا۔مجو بھائی فوراً جواب دیتا ہے:

> ''پیارے ایسا مت کہو یہ شہر بے فیض اب ہوا ہے اس وقت بے فیض ہوتا تو تم جھگی میں پڑے گلے سڑتے ہوتے۔''(۱۲)

کراچی شہر میں بھی کبھی مروتیں،محبتیں ہوا کرتی تھیں۔مادی ترقی نے لوگوں کی روایات ترجیحات اور رویوں میں تبدیلی پیدا کر دی وہ لوگ جن سے یہ شہر فیضیاب ہوا کرتا تھا آج ناپید ہو چکے ہیں۔وہ لوگ جن کو اس شہر نے نئی پہچان دی وہ بھی سیاسی،تہذیبی اور تمدنی ڈھانچے کے زوال پذیر ہونے کے غم میں بے بس،اور مجبور دکھائی دیتے ہیں کراچی شہر جدید دور کی نئی مصیبتوں اور مشکلات کا شکار ہے۔شہر کی صورتحال بہت خراب ہے۔دہشت گردی کے واقعات سے سارا معاشرہ اذیت اور خوف میں مبتلا ہے۔بے قصور لوگ گولیوں کا نشانہ بن جاتے ہیں۔خوف اور دہشت کی فضا سے سارا ماحول افسردہ ہو چکا ہے۔اس گھٹن زدہ ماحول میں کھلے ذہن کا مالک مجو بھائی دہشت گردی کا نشانہ بن جاتا ہے۔وہ کردار جو لوگوں کے چہروں سے نقاب اتارتا ہے۔اور تاریخی حوالوں اور طنزیہ فقروں سے ناول کو دلچسپ بناتا ہے۔وہ بھی اس شہر میں پھیلی ہوئی دہشت گردی کا شکار بن جاتا ہے۔

انتظار حسین نے ایک طرف تو پاکستان میں سیاسی اقتصادی اور سماجی کشمکش سے پردہ اٹھایا ہے۔تو دوسری طرف مہاجروں کو ان کے ماضی کے تناظر میں دکھایا ہے۔ہجرت کر کے آنے والوں نے ہندوستان میں رہ جانے والے رشتہ داروں سے روابط بالکل ختم کر لیے ہیں۔جو ایک بڑا المیہ ہے۔وہ لوگ جو ہندوستان میں رہنے والے رشتہ داروں سے تعلق توڑ بیٹھے

تھے۔انھیں گہرے طنز کا سامنا کرنا پڑا۔انتظار حسین مختلف لوگوں کے تاثرات بڑے حقیقی انداز میں پیش کرتے ہیں:

''چھوٹی پھپھو نے جواد سے کہا! اے بیٹا میں پوچھوں ہوں پاکستان کے پانی میں کیا ملا ہوا ہے وہاں جا کے خون سفید ہو جاویں ہیں مگر ہم اپنے دلوں کو کیا کریں پاکستان میں چودھویں صدی آ گئی ہم بخت مارے وہیں کے وہیں ہیں۔''(۱۳)

جبکہ رحیم الدین بابا کو اپنے بیٹے کرمو کی خیریت مطلوب ہے۔وہ جواد سے اپنے بیٹے کرمو کے بارے میں دریافت کرتا ہے جو پاکستان جانے کے بعد اس کو یکسر بھول گیا ہے:

''میاں میرے بڑھاپے پہ رحم کر کے ذرا یوں اسے ڈھونڈ یو مل جاوئے تو چار جوتے میری طرف سے ماریو اور کہیو ارے بدبخت ایک دفعہ تو بوڑھے باپ کو صورت دکھا جا اور نہیں تو خیریت ہی کی چٹھی لکھ۔''(۱۴)

جب کہ ننھی تائی جب اس سے گفتگو کرتی ہے تو اس کا انداز کچھ اور ہی ہوتا ہے:

''ننھی تائی بولیں اور اللہ کا سب سے بڑا شکر تو یہ ہے کہ تمہارا ہم گرے بڑوں کو دیکھنے کو جی چاہا برسوں بعد صورت دکھائی ہے مگر شکر ہے کہ صورت دیکھانے کا خیال تو آیا۔''(۱۵)

دلہن خالہ اپنی بہو کو دعائیں دیتے ہوئے کہتی ہے:

''تم پاکستان میں دودھوں نہاؤ پوتوں پھلو ہم صرف تمہاری صورت کے بھوکے ہیں جو لال تم میں ٹنکے ہوئے ہیں ہم انہیں نہیں توڑیں گے۔''(۱۶)

انتظار حسین نے اردو ناول کا تعلق قدیم داستان کی روایت سے قائم کیا ہے۔جبکہ زندگی کے بارے میں ان کا رویہ اور نقطہ نظر جدید ہے۔وہ اپنے رویے کے اعتبار سے جدید اور اسلوب کے لحاظ سے روائتی دکھائی دیتے ہیں۔ان کے ہجرت کر کے آنے والے کردار ماضی کو نہیں بھلا پاتے۔مصنف کے دیے گئے چھوٹے چھوٹے اقتباس ان کے اندازِ فکر اور جدیدیت کے عکاس ہیں:

''کراچی ایک انہونی صورتحال کا شکار ہے۔ابن حبیب اور عبداللہ کا مکالمہ حقیقی فضا میں مبنی ہے۔دہشت گردی نے گلی محلوں حتیٰ کے عبادت گاہوں کو بھی اپنی لپیٹ میں لے رکھا ہے۔موت کا کھیل کھیلا جا رہا ہے۔جس سے کوئی بھی محفوظ نہیں ہے۔جب جواد کو گولی لگتی ہے۔تو وہ بیہوشی کی حالت میں اجڑے ہوئے شہروں کو یاد کرتا ہے۔جب جواد کو ہوش آتا ہے۔تو مجو بھائی جواد کو کہتا ہے۔کہ''تم غنودگی کی حالت میں کیا بڑبڑا رہے تھے۔پتہ ہے تم بے ہوشی میں کیا کہتے رہے تھے۔جیسے دنیا کے سارے برباد شہر تمہارے دماغ میں گھس کر فتور پیدا کر رہے ہیں۔''(۱۷)

جواد حسین ماضی کو بے ہوشی کے عالم میں یاد کر رہا تھا۔اس میں برباد ہونے والے شہروں کی کہانیاں ہیں۔جو اس کے تحت الشعور میں موجود تھی۔جب وہ شعور میں آئیں تو جواد کا عجیب وغریب کلمات کہنا ان کی ماضی پرستی کی جھلک کو نمایاں کرتا ہے۔انتظار حسین ایک انٹرویو میں کہتے ہیں:

> ''یہ سوال مسلسل میرا تعاقب کر رہا ہے۔ پچاس برس ہو گئے ہیں اسی عرصے میں ماضی بھی بدل جاتا ہے۔ سوال کرنے والے یا انگلیاں اٹھانے والے کسی ماضی کی بات کرتے۔۔۔ کوئی ایک ماضی ہمیشہ نہیں رہتا۔''(۱۸)

پروفیسر ارتضیٰ کریم انتظار حسین کی معاشرتی، سماجی اور تہذیبی روایت پسندی کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''انتظار حسین کے بارے میں یہ ہی خیال عام ہو گیا ہے کہ وہ رجعت پسند ہیں اور ماضی کی بازیافت یا نوحہ خوانی پر یقین رکھتے ہیں جب کہ اس ناول کے تعلق سے کہا جا سکتا ہے کہ انتظار حسین کی تحریروں میں فرد اور سماج کے زوال سے اس قعر ذلت سے نکلنے اور نکالنے کی تدبیر اور فکر کارفرما نظر آتی ہے۔''(۱۹)

ناول کے مطالعہ سے محسوس ہوتا ہے کہ ناول میں زندگی کی بصیرت صرف مجو بھائی کے حوالے سے ہی سامنے آتی ہے۔ مجو بھائی نے لوگوں کی نفسیات، گفتگو اور ذہنی کج روی معصومانہ اور احمقانہ انداز میں پیش کیا ہے۔ مجو بھائی کا کردار لوگوں کی سوچ اور فکر پر بھی بڑا گہرا طنز کرتا ہوا کہانی کو بھی آگے بڑھاتا ہے۔ وہ مختلف واقعات کو جن میں مرزا ہادی علی بدایونی کا مشاعرہ، اسلام پر لیکچر کے دارانِ بہاریوں کا مہاتما بدھ کے مجسمے کے حوالے سے کیا جانے والا طنز بڑی خوب صورتی سے بیان کرتا ہے۔ اسی طرح لکھنوی نازک مزاج کے حوالے سے آقا حسین اور رفیق کے درمیان بیٹی، بیٹے کا رشتہ طے نہ ہونا بھی ایک کھلی حقیقت ہے۔ ڈاکٹر ممتاز احمد خاں 'آگے سمندر ہے' ناول کو زندگی کی بصیرت قرار دیتے ہوئے لکھتے ہے:

> ''ناول میں مختلف کرداروں مجو بھائی کی موجودگی اور ان کی بات سے بات کو آگے بڑھانے کی خصوصیت کی وجہ سے زبردست نوک جھونک جاری رہتی ہے۔ اب چوں کہ سیاست نے بہت سے تعصّبات کو نیچے کی سطح سے نکال کر اونچی سطح پر برتنا شروع کر دیا ہے اور اذہان تبدیل کرنے شروع کر دیئے ہیں لہٰذا فکشن میں بھی ان باتوں پر نہ صرف روشنی پڑنا چاہیے بلکہ زندگی کی بصیرت بھی ابھرنا چاہیے اس لیے کہ حقیقت کا دبایا جانا قوموں کے لیے مہلک ہوتا ہے پھر جب قوم ایسے دوراہے پر کھڑی ہو جہاں سے مختلف شاہراہیں گزر رہی ہوں اور محسوس ہوتا ہو گویا ہر راستے پر جانا انتہائی تاریک رات میں پہاڑ سے نیچے بہتے ہوئے زہریلے پانی میں چھلانگ لگانے کے مترادف ہو تو صحیح سمت کی نشاندہی ازبس ضروری ہو جاتی ہے۔''(۲۰)

حوالہ جات

۱۔ انیس ناگی، پاکستانی اردو ادب کی تاریخ (لاہور: جمالیات، ۲۰۰۴ء) ص ۲۰۲۔۲۰۳
۲۔ انتظار حسین، تذکرہ (لاہور: سنگ میں پبلی کیشنز، ۱۹۸۷ء) ص ۱۸۷
۳۔ ایضاً، ص ۱۲۱
۴۔ ایضاً، ص ۲۳۷
۵۔ وزیر آغا، انتظار حسین کا تذکرہ، مشمولہ: کتاب نما (نئی دہلی، ستمبر ۱۹۸۷ء) ص ۱۳
۶۔ انتظار حسین، تذکرہ، ص ۲۲۹
۷۔ وزیر آغا، انتظار حسین کا تذکرہ، ص ۱۳
۸۔ انتظار حسین، آگے سمندر ہے (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۰ء) ص ۳۹
۹۔ انتظار حسین، آگے سمندر ہے، ص ۵
۱۰۔ ایضاً، ص ۱۳۔۱۴
۱۱۔ ایضاً، ص ۲۷۰
۱۲۔ ایضاً، ص ۲۰۴
۱۳۔ ایضاً، ص ۱۵۷
۱۴۔ ایضاً، ص ۱۵۲
۱۵۔ ایضاً، ص ۲۸
۱۶۔ ایضاً، ص ۲۸
۱۷۔ ایضاً، ص ۲۹۴
۱۸۔ نگار اظہر جاوید، انتظار حسین سے انٹرویو، مشمولہ: اخبار جہاں (لاہور، ۳۰ / اگست تا ۵ / ستمبر ۱۹۹۹ء) ص ۲۰
۱۹۔ ارتضیٰ کریم، نیا سفر (الہ آباد، شمارہ ۹۔۱۰) ص ۳۷۵
۲۰۔ ممتاز احمد خان، اردو ناول کے چند اہم زاویے (کراچی: انجمن ترقی اردو پاکستان، ۲۰۰۳ء) ص ۱۳۶۔۱۳۷